ڈاکٹر الف ۔ د ۔ نسیم*

# شاہ گلشن دہلوی

برّصغیر پاک و ہند میں مغلیہ دور زوال کی دہلی کے تاریخی اوراق جہاں دردناک داستانیں اور دلخراش واقعات لیے ہوئے ہیں کچھ ایسی تصویریں بھی رکھتے ہیں جن کے رنگوں کی چمک دمک صفحات کی گہری سیاہی کے احساس کو کسی قدر کم کر دیتی ہے ۔ اگرچہ بعض نقوش کو دیکھتے ہی دریچۂ چشم بند کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن بعض تصاویر ایسے خطوط و دوائر اور جاذب نظر رنگ لیے ہوئے ہیں کہ جی چاہتا ہے انھیں دیکھنے کے لیے در چشم دیدۂ نرگس کی طرح وا رہے ۔ ان تصویروں میں علم و فضل ، شعر و ادب ، رنگ و سنگ اور تصوّف و عرفان کی تصویریں خصوصی جاذبیت رکھتی ہیں میر تقی میر نے بارہویں صدی ہجری کی دلّی کے اس پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا تھا :

؎ دلّی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

انھی شکلوں میں ایک شکل اس دور کے مشہور صوفی بزرگ ، شاعر اور موسیقار حضرت سعد اللہ المعروف بہ شاہ گلشن دہلوی کی تھی جن کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے جنوبی ہند کے مشہور شاعر ولی نے اپنی شاعری کا رخ دکنی زبان سے اس دہلوی زبان کی طرف موڑا تھا جو آج اردو کا لبادہ پہنے برّصغیر میں اور برّصغیر سے باہر کروڑوں لسانی اور ادبی دلوں کی دھڑکن بنی ہوئی ہے ۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر شاہ گلشن دہلوی ولی کو جنوبی ہند کی زبان دکنی سے گریز کرکے دہلوی زبان یعنی اردوئے معلّی شاہجہان آباد میں شاعری کرنے کی تلقین نہ کرتے تو اردو زبان و ادب کے رواج میں کتنا وقت اور لگتا لیکن اس بات میں کسی کو اختلاف نہیں کہ ولی کے اس دیوان نے جو دہلوی زبان یا ریختہ یا اردوئے معلّیٰ میں تھا شمالی ہند خصوصاً دہلی کی لسانی اور ادبی دنیا میں انقلاب عظیم ضرور برپا کیا اور عروس البلاد دہلی کے شعرا نے ریختہ کو یوں گلے لگایا جیسے انھیں کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہو اور لوگ اسے تبرک کے طور پر گھر گھر قریہ قریہ اور شہر شہر لے گئے ۔ ولی کا دیوان ریختہ وہ خشت اوّل تھی جس پر بعد میں پوری اردو شاعری کی عمارت استوار ہوئی اور اردو زبان و ادب کے آغاز اور ارتقا کا سبب بنی ۔ شاہ گلشن دہلوی کی نصیحت ، جس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا ، وہ عظیم کارنامہ ہے جس نے انھیں اردو کے محسن اعظم کی حیثیت دے رکھی ہے ۔

---

*سابق استاد اردو، گورنمنٹ کالج، ساہیوال

شاہ گلشن دہلوی کا سلسلہ نسب حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے ۔[1] ان کے آباؤ اجداد ملک عرب سے آ کر گجرات میں آباد ہوئے ۔[2] سلاطین گجرات کے مشہور وزیر اسلام خان انھی کے اجداد میں سے تھے ۔[3] غلام علی آزاد بلگرامی مولف تذکرۂ سرو آزاد[4] اور مولف تذکرہ نشتر سخن کے بیان کے[5] مطابق ان کے بعض بزرگ سلاطین گجرات کے انقراض اور شہنشاہ اکبر کے استیلا کے وقت گجرات چھوڑ کر جنوبی ہند کے مشہور قصبہ برہان پور میں آ کر آباد ہو گئے تھے ۔[6]

مولف مفتاح التواریخ اس شہر کے تعارف میں کہتے ہیں[7] :

''مصریست بزرگ ـــ دارالملک ایں صوبہ (خاندیس) بہ ساحل دریائے تپتی ـــ گوناگون مردم صاحب ہنر درو آباد و در حواشی آن باغات دل کشا فراوان ـــ صندل و عود و انواع میوہ و گوناگوں گل ہا پیدا یابد و در تابستان گرد بسیار خیزد و در بارش گل و لالہ فراواں بود ۔''

اولیائے کرام اور شعرائے عظام کے تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ گلستان برہان پور کسی زمانے میں واقعی علما ، مشائخ ، اولیا ، صلحا اور شعرا کے شاداب پھولوں کی بہار لیے ہوئے تھا[8] ۔ شاہ گلشن کا گل زندگی بھی سعد اللہ کے نام سے اسی گلشن میں کھلا لیکن عروس البلاد شاہ جہان آباد (دلّی) میں کچھ ایسی بات تھی کہ تقریباً بیس سال برہان پور میں گزارنے کے بعد شاہ گلشن دلّی میں آ گئے ۔

اس وقت کی دلی میر تقی میر کے اس شعر کے مصداق تھی :

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراق مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

---

١- تذکرہ بے نظیر ، ص ١٥
٢- تذکرہ شمع انجمن ، ص ٤٠٧
٣- تذکرہ روز روشن ، ص ٥٨٦
٤- تذکرہ سرو آزاد ، ص ١٩٩
٥- تذکرہ نشتر سخن ، ص ٨٥ الف
٦- مفتاح التواریخ ، ص ٥٢
٧- مفتاح التواریخ ، ص ٥٢
٨- دیکھیے تذکرہ وفیات الاخیار ، تذکرۃ الصلحا ، تذکرہ اذکار الابرار ، تذکرہ نکات الشعرا ، تذکرہ مخزن نکات ، تذکرہ مردم دیدہ ، تذکرہ گل رعنا ، تذکرہ چمنستان شعرا ، تذکرہ گل عجائب ، تذکرہ محبوب الزمن ، تذکرہ ریختہ گویاں ، تذکرہ گلشن گفتار ۔

ان تصویروں میں ایک تصویر شیخ عبدالاحد المتخلص بہ شاہ گل کی تھی جو اپنے وقت کے اولیائے عظام میں سے تھے - شیخ سعد اللہ (شاہ گلشن) کو اس میں کچھ ایسی جاذبیت نظر آئی کہ وہ اسی کے ''مجذوب'' ہو کر رہ گئے اور اپنے گلے میں ان کا طوق بیعت ڈال لیا ۔[1] شاہ گلشن کے دامن میں ذوق عرفان اور احوال تصوف کے جتنے پھول دیکھنے میں آتے ہیں - سب شاہ گل ہی کے چمن صحبت اور باغ کرم کا فیضان ہے -

شیخ عبدالاحد معروف بہ شاہ گل شیخ سرہندی حضرت مجدد الف ثانی کے پوتے اور خواجہ محمد سعید کے بیٹے اور خلیفہ تھے - ان کا مولد و موطن تو سرہند ہی تھا لیکن وہ اس وقت دلی آ گئے تھے جب سکھ گرو بندہ بیراگی نے سرہند ہی کو تباہ کر دیا تھا - دلی میں ان کا قیام کوٹلہ فیروز شاہ میں تھا جہاں انھوں نے اپنا حلقہ بنا لیا تھا جس میں دلی اور بیرون دلی کے مشائخ اور درویش شامل ہونے لگے تھے - شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصنیف انفاس العارفین سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے والد شاہ عبدالرحیم بھی اس حلقے میں جاتے تھے - خود شاہ ولی اللہ محدث نے شیخ عبدالاحد کے ایک مرید حاجی محمد افضل سے حدیث پڑھی ہے - شیخ سعد اللہ بھی برہان پور سے آ کر اس حلقہ میں آنے لگے اور پھر شیخ عبدالاحد کے دست حق پرست پر نقشبندیہ سلسلے میں بیعت ہوگئے[2] -

لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے تذکرہ گل رعنا میں جہاں یہ لکھا[3] ہے کہ ''شیخ عبدالاحد سرہندی بر جادۂ درویشی و قناعت مستقیم بود'' یہ بھی بتایا ہے کہ ''بنا بر تفنن طبع متوجہ بہ شعر می شد''- صاحب مخزن الغرائب نے یہ انکشاف کیا ہے[4] کہ ''آخر از گفتن شعر تو بہ نمود'' - شاعری میں ان کے دو تخلص تھے ایک وحدت اور دوسرا گل - لیکن گل نے ایسا رنگ جمایا کہ وہ مشہور ہی شاہ گل کے نام سے ہوگئے - شیخ سعد اللہ نے اسی مناسبت سے اپنا تخلص گلشن کیا اور اصل نام کی جگہ شاہ گلشن کے نام سے معروف ہوگئے -

شاہ گل کا شاہ گلشن پر دوگونہ اثر تھا - ایک روحانی اور دوسرا فنّی - روحانی دنیا میں شاہ گلشن کی پرواز کہاں تھی اس سوال کے جواب پر کمند پھینکنا تو مشکل ہے البتہ اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ تجرّد و تفرّد میں انھوں نے جو مرتبہ

---

۱- گل رعنا (فارسی مخطوطہ) ، ص ۲۸۸
(الف) شمع انجمن ، ص ۳۰۷ - قاموس جلد ۲ ، ص ۱۶۳ - مجمع النفائس (مخطوطہ فارسی) ۳۱۸ ب

۲- تذکرہ روز روشن ، ص ۵۸۶

۳- گل رعنا (فارسی مخطوطہ) ص ۲۸۸ الف

۴- مخزن الغرائب (فارسی مخطوطہ) ص ۳۷۱ ب

پایا وہ قدما میں بہت کم بزرگوں میں دیکھنے میں آیا ہے۔ کتاب ''حالات و مقامات مرزا مظہر جانجاں'' سے پتہ چلتا ہے[1] کہ شاہ گلشن نے اپنے پیر و مرشد سے خلافت حاصل کرنے کے باوجود اپنی مشیخت کا اظہار نہیں کیا۔ مولف ریاض العارفین نے بھی اس کی تائید ان الفاظ میں کی ہے۔[2]

''مشیخت قبول نمی نمود و در نہایت تجّرد بسر می برد''

چند دوسرے معاصر تذکرہ نگاروں نے بھی ان کی روحانیت کے اس خصوصی پہلو کا ذکر کیا ہے۔ سراج الدین علی خان آرزو تذکرہ مجمع النفائس میں لکھتے ہیں۔[3]

''تجرید و تفرید کہ داشتند کم تر از قدما داشتہ باشد''

غلام علی آزاد بلگرامی تذکرہ سرو آزاد میں کہتے ہیں۔[4]

''از وحشت کدہ دنیا رم و بر تجرد و توکل ثبات قدم داشت''

مولف ریاض العارفین شاہ گلشن کے مرتبہ تجرد و تفرد کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں[5] کہ ایک جامہ خش بارہ سال تک پہنے رکھا۔ مولف کتاب حالات و مقامات مرزا مظہر جان جاناں نے گلشن کا اپنا بیان نقل کیا ہے جس سے انکشاف ہوتا ہے کہ ایک گودڑی تیس سال تک ان کے دوش مبارک پر رہی۔ تین تین دن کے بعد کچھ کھانے کا خیال پیدا ہوتا تھا تو درختوں کے پتے یا خربوزوں اور خیارین کے چھلکے پانی سے صاف اور مطہر کرکے کھا لیا کرتے تھے۔ شدید گرمی میں کسی سے حوض مسجد کا پانی مانگا۔ کہنے والے نے کہا کہ قریب ٹھنڈے پانی کا ایک کنواں ہے وہاں سے پانی نہ لے آؤں۔ شاہ گلشن نے جواب دیا سالہا سال سے اس مسجد میں ہوں مجھے تو معلوم نہیں کہ یہاں کوئی ٹھنڈے پانی کا کنواں بھی ہے۔

ایک دفعہ شاہ گلشن خاموشی سے احمد آباد گجرات کی طرف چلے گئے مدت تک مفقود الاثر رہے۔ جب واپس آئے تو کسی نے اس خاموش غیبت کا سبب پوچھا

---

۱۔ حالات و مقامات مرزا مظہر جانجاں، ص ۵۸
۲۔ ریاض العارفین، ص ۲۱۲
۳۔ مجمع النفائس، ص ۳۱۸ الف (مخطوطی)
۴۔ سرو آزاد، ص ۱۹۹
۵۔ ریاض العارفین، ص ۲۱۲
۶۔ حالات و مقامات مرزا مظہر جانجاں، ص ۵۸

جواب دیا میں نے سنا تھا کہ احمد آباد گجرات میں وقت غروب خوشی ہے میں دیکھنے چلا گیا اور اب واپس آ گیا ہوں - - - ریاض العارفین میں ان کے یہ الفاظ موجود ہیں -[1]

''شنیدہ بودم کہ احمد آباد گجرات در وقت غروب خوش است رفتم ، دیدم و حال برگردیدم''-

احمد آباد گجرات کا سفر محض اس لیے کرنا کہ وہاں وقت غروب خوش کن ہے اور مدتوں دہلی سے ایسا غائب رہنا کہ کسی کو خبر تک نہ ہوئی کہ کہاں گئے ان کی کیفیت سکر کو ظاہر کرتی ہے- سرخوش نے تذکرہ کلمات الشعرا میں شاید اسی لیے ان کی اس حالت کو حالت جنوں سے تعبیر کیا ہے - لکھتے ہیں :[2]

''جنونے بہم رسانیدہ از دارالخلافہ برآمد الحال درگجرات بسر می برد''

خوش گو نے سفینہ خوش گو میں ان کے اس اقدام کو مزاج کی وارستگی کہا ہے -[3]

دراصل یہ برق تجلی کی فراوانی کے تحت وہ حالت تھی جو جذب و سکر کہلاتی ہے اگر یہ جنوں تھا تو خوش جنوں تھا - سودا تھا تو خوش سودا تھا وارستہ مزاجی تھی تو خوش وارستگی تھی - مولانا روم نے ایسے ہی سودا اور وارستگی کے متعلق کہا ہے ؎

شادباش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علت ہائے ما

یہ ایسا خوش سودا تھا کہ جس نے شاہ گلشن کی ہر علت کا علاج کر کے انھیں توکل و قناعت اور تجرد و تفرد کا پیکر بنا دیا تھا -

معلوم ہوتا ہے کہ ان کا احمد آباد کا سفر اپنے آبائی وطن کو دیکھنا تھا یہ ان کا سودا نہیں تھا شوق زیارت وطن آبا تھا اور خار وطن از سنبل و ریحاں خوش تر کے فلسفہ کے تحت اگر انھیں وہاں کی شام خوش کن لگی تھی تو اس میں حیرت کون سی بات ہے - غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنے تذکرہ سرو آزاد میں شاہ گلشن کے سفر گجرات کی یہی وجہ لکھی ہے -[4]

احمد آباد گجرات کے علاوہ ان کے ایک سفر حج کا ذکر بھی تذکروں میں ملتا ہے - اس سفر کا ایک حصہ انھوں نے با پیادہ کیا تھا - چنانچہ سراج الدین علی خان آرزو تذکرہ مجمع النفائس میں لکھتے ہیں -[5]

---

۱- ریاض العارفین ، ص ۲۱۱-۲۱۲
۲- کلمات الشعرا ، ص ۹۶
۳- تذکرہ سفینہ خوش گو - ذکر شاہ گلشن
۴- سرو آزاد ، ص ۱۹۸
۵- تذکرہ مجمع النفائس ، ص ۳۱۸ الف

''از بندرمیخا تا مکہ معظمہ کہ یک ماہ راہ باشد تخمیناً پا پیادہ بےزاد و راحلہ بہ حج رفتند ۔ تجریدی و تفریدی کے داشتند کم تر کسے از قدما داشتہ باشد'' ۔

شاہ گلشن کا یہ بے زاد راہ پا پیادہ سفر بھی ان کے مقام تجرید و تفرید پر دال ہے ۔ مولف اوریئنٹل بائیگرافیکل ڈکشنری نے اس سفر میں ان کے پیر و مرشد شاہ عبدالاحد گل کے بھی ان کے ہمراہ ہونے کا ذکر کیا ہے ۔[1] آرزو کے تذکرے میں اس کا ذکر نہیں ۔[2] البتہ مخزن الغرائب اور قاموس میں اس ساتھ کا ذکر ضرور موجود ہے ۔[3] مولف کتاب حالات و مقامات مرزا مظہرجان جاناں نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ ایک صرہ (سکہ) ان کے پاس تھا ایک سائل نے سوال کیا اسے دے دیا اور کہا :[5]

کہ فرضیت حج از ذمہ ساقط گشت

یہ حج فرضیت کی بنا پر نہیں شوق کی بنا پر معلوم ہوتا ہے ۔تجرد و تفرد فرض ہے کب دیتا ہے جو آیا دوسرے کو دے دیا ۔ اسی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ خیال آیا کہ زکواۃ دی جائے جب منصب زکواۃ فراہم ہوا زکواۃ اور نصاب دونوں راہ خدا میں دے دیے اور کہا کہ

''در ادائے فرض الہی قرب خاص حاصل می شود''

ان اعمال و اقوال میں حضرت شاہ گلشن کی تجرید و تفرید کی اس بے مثال زندگی کا عکس ہے جو اخص ہی کا حصہ ہو سکتا ہے اسی بنا پر سراج الدین علی خان آرزو نے کہا ہے :[6]

''تجریدی و تفریدی کہ داشتند کم تر کسے از قدما داشتہ باشد''

اور مولف حالات و مقامات مرزا مظہر نے خانقاہ جنیدیہ کے سالکوں میں

---

۱- اوریئنٹل بائیگرافیکل ڈکشنری ، ص ۱۴۶

۲- مجمع النفائس مخطوطہ ، ص ۳۱۸ الف

۳- مخزن الغرائب ، ص ۳۷۱ ب مخطوطہ

۴- قاموس ج ۲ ، ص ۱۶۳

۵- حالات و مقامات مرزا مظہر جانجان ، ص ۵۸

۶- مجمع النفائس ، ص ۳۱۸ الف

شمار کیا ہے ۔ کہتے ہیں ۔[1]

''وے تواں گفت کہ محل غبطہ سالکان خانقاہ حضرت جنید است''

صاحب تذکرۂ نشتر سخن لکھتے ہیں ۔[2]

''مرد پاک نژاد بود''

لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کا کہنا ہے :

''مرد قدسی نژاد بود''

سراج الدین علی خان آرزو نے مجمع النفائس میں یہاں تک لکھا ہے کہ اکثر اوقات حجرے میں چراغ روشن نہ کرتے اور اپنے لیے کوئی چیز نہ پکاتے تھے لیکن غیب سے سب کچھ پہنچتا تھا ۔ یہ لکھ کر مزید لکھتے ہیں کہ ایک سال رمضان المبارک کے آخری دنوں میں خواجہ میر درد کے والد خواجہ ناصر عندلیب اور میں ان کو ملنے کے لیے گئے اور یہ خیال کیا کہ آج ان کے مہمان رہیں گے جب ہم پہنچے تو وہ مسجد میں تشریف رکھتے تھے ۔ انھوں نے ہمارے لیے کپڑا بچھا دیا ہم اس پر بیٹھ گئے اور گفتگو شروع ہوئی اسی حالت میں عصر اور عصر سے مغرب کا وقت ہوگیا ۔ شیخ نے کچھ پکایا ہوا نہ تھا اتفاقاً شام کے وقت ایک جوان طعام لایا شاہ گلشن کا نام پوچھا اور کہا کہ فلاں شخص نے آپ کے لیے کھانا بھیجا ہے ۔ کہنے لگے سبحان اللہ میری خاطر میں گزرا تھا کہ مہمان آئے ہوئے ہیں تحقیق ان کا رزق ضرور پہنچے گا۔ خان آرزو کہتے ہیں کہ طعام اس قدر تھا کہ ہم دونوں نے خوب سیر ہوکر کھایا لیکن پھر بھی دوسروں کے لیے بچ گیا ۔

شاہ گلشن دہلوی ترک و تجرید کہ اس اخص مقام پر فائز ہونے کے باوجود فن سے گہری محبت رکھتے تھے ۔ موسیقی اور شاعری دونوں میں ان کا امتیازی مقام ہے ۔ کلمات الشعرا کے مصنف سرخوش نے ان کے سفر گجرات کو چنوں سے تعبیر کیا تھا یہ ان کی بے خبری کی دلیل ہے ۔ وہ اپنی کیفیات میں گم شخص تھے کون نہیں جانتا کہ شاعری اور موسیقی دونوں کا تعلق کیفیات سے ہے ۔ صاحب جنوں کو ان سے کیا واسطہ ۔ علمائے شعر کے نزدیک شاعری تخییل اور جذبے ہی کا نام ہے ۔ یہ دونوں چیزیں شاہ گلشن میں نقطہ عروج پر تھیں ۔ سلسلہ

---

۱۔ حالات و مقامات ، ص ۵۸

۲۔ نشتر سخن ، ص ۴۸۵ الف مخطوطہ

۳۔ گل رعنا مخطوطہ ، ص ۲۵۲ ب

۴۔ مجمع النفائس ، ص ۳۱۸ الف

نقشبندیہ میں موسیقی (سماع) کا اگرچہ دخل نہیں ہے لیکن کلیتاً ممنوع بھی نہیں۔ سماع ان کے ہاں بھی ہے لیکن چند شرائط خصوصاً مزامیر کے ہونے کی شرط کے ساتھ۔ خود اس سلسلہ عالیہ کے نقشبند حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی سے سماع کے متعلق جب استفسار کیا گیا تھا تو انھوں نے فرمایا تھا کہ :[1]

"انکار نمی کنم و این کار نمی کنم"

خود کام نہ کرنا لیکن اس سے انکار نہ کرنا ایسا نظریہ ہے جو اس کام کے جائز ہونے کی راہ کھلی رکھتا ہے۔ خود خواجہ بہاؤالدین نقشبند یہ کام نہ کرنے کے باوجود مرتے وقت یہ وصیت کر گئے کہ میرے جنازے کے آگے یہ بیت پڑھتے جائیں ؎

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو شی للہ از جمال روئے تو[2]

شاہ گلشن دہلوی خود بھی سماع اور موسیقی کے رسیا تھے۔ موسیقی میں تذکرہ نگاروں نے شاہ گلشن کو امیر خسرو کے پایہ کا موسیقار قرار دیا ہے، مولف نشتر سخن کہتے ہیں کہ :[3]

"در علم موسیقی کمال تحقیقات پیدا کردہ کہ ویرا امیر خسرو ثانی می گفتند"

نواب صدیق حسن خان تذکرہ روز روشن میں لکھتے ہیں کہ :[4]

"در فن موسیقی بہ غایتے رسید کہ خسرو ثانی مشتہر گردید"

لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کے تذکرہ گل رعنا میں ہے کہ :[5]

"در موسیقی ہندی بہ حدے ماہر بود کہ او را امیر خسرو زماں می داشتند"

سراج الدین علی خان آرزو نے مجمع النفائس میں لکھا ہے :[6]

"اکثر خواننده ہائے دہلی شاگردان او بودند"

محمد حسین آزاد نے نقشبندیہ سلسلہ کے نامور بزرگ خواجہ ناصر عندلیب اور ان کے بیٹے نے خواجہ میر درد کی مہارت موسیقی کا ذکر بھی کیا ہے کہ شہر دہلی کے اکثر

---

۱- سفینۃ الاولیا، ص ۷۸-۷۹
۲- نشتر سخن، ج ۲، ص ۴۸۵
۳- روز روشن، ص ۵۸۶
۴- گل رعنا، ۲۵۲ ب
۵- مجمع النفائس، ص ۳۱۸
۶- آب حیات ذکر میر درد۔

موسیقار راگ کے سلسلے میں ان سے مشورہ لیتے تھے ۔ خواجہ میر درد نے اپنی مشہور تصنیف علم الکتاب اور رسائل نالہ دل، آہ سرد، شمع محفل، واردات اور نالہ درد وغیرہ میں سماع اور موسیقی سے اپنے شغف اور تعلق کا ذکر کیا ہے ۔ نقشبندیہ سلسلہ میں ہونے کے باوجود ان حضرات کا سماع اور موسیقی سے تعلق ہونا بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ان کے مورث اعلیٰ حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند کے اس قول کے مطابق کہ ''انکار نمی کنم و این کار نمی کنم'' میں اجازت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے ۔

سماع اور سلسلہ نقشبندیہ کے تعلق پر بحث کا یہ مقام نہیں البتہ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ صوفیا کے سلسلے میں جب ہم موسیقی کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ کوئی اہل نشاط میں سے ہیں یا کوئی مطرب یا سازندے ہیں بلکہ مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ سرتال اور راگ رموز و اسرار سے واقف ہوتے ہیں اور انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مروج راگوں اور ان کے سر تال کے انداز اور طور کیا ہیں ۔ ان کے گانے کے اوقات اور ان کے اثرات کیا ہیں ۔ ان اسرار سے واقفیت کی بنا پر انھوں نے اپنے روحانی ذوق کی تسکین اور دوسروں کے اندر روحانی اشتعالک پیدا کرنے کے لیے ان راگوں اور سرتالوں کا بڑا مناسب ، پراثر اور نتیجہ خیز استعمال کیا ہے اور لوگوں کی جس سماع کو تڑپا کر اللہ سے لو لگانے کا راستہ کھولا ہے ۔ خصوصاً برصغیر کے غیر مسلم معاشرہ میں جو راگ راگنیوں کو مذہب اور سر کو خدا مانتا ہے اس عمل نے بہت بڑا اور نتیجہ خیز روحانی کام کیا ہے ۔ جو لوگ دنیا داروں اور کوٹھوں کی موسیقی اور صوفیا کی موسیقی میں مماثلث پیدا کرکے ان دونوں کو ایک سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں ان دونوں میں وہی فرق ہے جو زنا اور نکاح میں فرق ہے ۔ عمل ایک لیکن نتائج و اثرات میں مختلف ۔ پھر اس قسم کا الزام لگانا کہ صوفیا ہندؤں کے بشن پد گایا کرتے تھے ۔ یہ الزام تراشی بھی موسیقی کے فن سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے ۔ بشن پد ، دھر پد ، خیال ، ٹھمری ، قول ، قلیانہ ، وغیرہ سب راگوں کے نام ہیں صرف سرتال کی حد تک بھیرویں کے الفاظ در اصل ان کو رحمانی یا شیطانی ، اسلامی یا ہندوانہ بناتے ہیں ۔ بشن پد تو محض راگ کی ایک طرز ہے خاص موقع خاص وقت اور خاص مجلس میں اثر انگیزی پیدا کرنے کے لیے ۔ یہ تو ایک خول اور جسم ہے جس کی جان اور روح اس کے بول ہیں ۔ اگر بول انسانی جذبات ابھارنے والے ہیں تو یہ اور بات ہے اور اگر حیوانی جذبات پیدا کرنے والے ہیں تو اور ۔

موسیقی اور شعر کا جسم و جان کا تعلق ہے ۔ راگ کے لیے بول ضروری ہیں ، محض ساز بھی راگ الاپ سکتا ہے لیکن یہ گونگے کی زبان کے مترادف ہے ۔ اصل صورت ساز اور آواز دونوں ہیں ۔ موسیقی اور شعر کے اس تعلق سے جہاں شاہ گلشن دہلوی کی شاعری میں حسن پیدا ہو گیا ہے ان کے صحت یافتہ موسیقی و سماع اور شعر و شاعری کا ذوق رکھنے والوں کے کلام میں بھی اس کی جھنکار پیدا کی ہے اور یہ جھنکار شاہ گلشن کے آستانے سے لے کر خواجہ ناصر عندلیب اور ان کے بیٹے خواجہ میر درد کے آنگن تک سنائی دیتی چلی جاتی ہے ۔

حضرت شاہ گلشن فارسی کے عظیم شاعر بھی تھے ۔ ان کے پیر و مرشد حضرت شاہ عبدالاحد المتخلص بہ وحدت وگل نے تو شاعری کو تفنن طبع کے طور پر اختیار کیا تھا اور بعد میں اس سے توبہ کرلی تھی لیکن شاہ گلشن نے اس فن کو باقاعدگی سے اختیار کیا ان کے مرشد کا تخلص چونکہ گل تھا اس لیے انھوں نے اس نسبت سے اپنا تخلص گلشن رکھا ۔ سراج الدین علی خان آرزو نے مجمع النفائس میں لکھا ہے کہ ان کو یہ تخلص رکھنے کے لیے اس زمانے کے مشہور عارف شاعر مرزا عبدالقادر بیدل نے کہا تھا ۔ خان موصوف نے شاہ گلشن کے مرزا کے شاگرد ہونے کا ذکر بھی کیا ہے لکھتے ہیں کہ :[1]

''در شعر شاگرد میرزا عبدالقادر بیدل بود و اما آنچہ از زبان الہام ترجمانش مسموع است ہمیں قدر است کہ میرزا بیدل این تخلص بہ من دادہ و چون نسبت گل و گلشن ملاحظہ کردم اختیار نمودم''

مؤلف ریاض العارفین نے لکھا ہے کہ پہلے تذکرہ کلمات الشعرا کے مولف محمد افضل سرخوش کے شاگرد تھے[2] اور بعد میں مرزا عبدالقادر کی شاگردی میں آئے ۔ تذکرہ حسینی کے مولف نے انہیں میرزا عبدالقادر کا معاصر لکھا ہے[3] لیکن باقی سب طرز نگاروں نے شاگرد ہی کہا ہے ۔

شاہ گلشن دہلوی سے ایک بیان کے مطابق ایک لاکھ اور دوسرے بیان کے مطابق ایک لاکھ بیس ہزار اشعار منسوب ہیں ۔ اسپرنگر نے فہرست کتب خانہ اودھ میں تذکرہ ہمیشہ بہار کے حوالے سے ایک لاکھ اور خان آرزو نے مجمع النفائس میں ایک لاکھ بیس ہزار تعداد بتائی ہے ۔ اسپرنگر نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ سارے اشعار غزل کے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے یہ اشعار مختلف انواع کے ہیں ۔

---

۱۔ مجمع النفائس ، ص ۳۱۸
۲۔ ریاض العارفین ، ص ۲۱۲
۳۔ تذکرہ حسینی ، ص ۲۸۴

نواب صدیق حسن خان تذکرہ روز روشن میں کہتے ہیں کہ :[1]
''اشعارش از انواع نظم زاید بر یک لک بیست بہ شمار آمدہ''

سراج الدین علی خان آرزو تذکرہ مجمع النفائس میں لکھتے ہیں[2] :
''اشعار گوہر بار ایشاں قریب یک صد و بیست ہزار است مشتمل بر غزل و قصیدہ و مثنوی و رباعی''

قصائد میں سے ایک قصیدہ ۶۲۰ اشعار پر مشتمل امیر خسرو کے قصیدے کے جواب میں ہے جس میں سے خان آرزو نے ۶۶ اشعار کا انتخاب دیا ہے اور یہ کہہ کر معذوری کا اظہار کیا ہے کہ :[3]

''چون دیوان آنحضرت خیلے ضخیم است اگر تمامش را انتخاب می کردم کتاب علحدہ باشد''

یہ حیرت کہ ترک و تجرید اور ریاضت و اشغال کے باجود شاہ گلشن نے اتنی تعداد میں شعر کیسے کہے ہیں خان آرزو کے اس بیان سے دور ہو جاتی ہے :[4]

''چون برداشت باوقات تجلی را نمی توانستند اکثر اوقات خود را بہ شعر مشغول داشتند اور پرگفتن شعر را ہمین سبب''

اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ شعر گوئی ان کا مقصد اولین نہیں تھا بلکہ انکا یہ شغف بہ امر مجبوری تھا ان کے مرشد شیخ عبدالاحد سرہندی بتخلص بہ وحدت بھی فرصت اشغال باطنی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شعر کی طرف متوجہ ہوتے تھے - شعر گوئی ان کا بھی مقصود نہیں تھا بلکہ جیسا کہ مولف گل رعنا کے بیان سے پتہ چلتا ہے اس فن کو انھوں نے تفنن کے طور پر اختیار کیا تھا۔گل رعنا کی عبارت یہ ہے[5] :

''شیخ عبدالاحد مشہور بہ شاہ گل بن شیخ محمد سعید بن مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی است - برجادۂ درویشی و قناعت مستقیم بود و در کوٹلہ فیروز شاہ واقع دہلی کہنہ می گذرانید و ہرگاہ از اشغال باطنی فرصتے دست می داد گاہے بنا بر تفنن طبع متوجہ بہ شعر می شد''

---

۱- تذکرہ روز روشن ، ص ۵۸۶
۲- مجمع النفائس ، ص ۴۱۸
۳- مجمع النفائس ، ص ۴۱۸
۴- مجمع النفائس ، ص ۴۱۸ -
۵- گل رعنا ، ص ۲۸۸ الف -

شاہ گلشن دہلوی نے اپنے پیر و مرشد شیخ عبدالاحد معروف بہ شاہ گل کے مقابلے میں ایک لاکھ اور ایک بیان کے مطابق ایک لاکھ بیس ہزار شعر کہے ہیں محض اس لیے کہ شاہ گل نے شاعری سے توبہ کر لی تھی لیکن شاہ گلشن نے اسے جاری رکھا ۔ مولف مخزن الغرائب شاہ گل کے ترک شاعری کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :[1]

''در ریعان جوانی بہ گفتن شعر طبع راگل فشان می کرد ۔ آخر از گفتن شعر تو بہ نمودہ''

شاہ گلشن کی پرگوئی کے باوجود ان کے شعر رطب و یابس سے پاک ہیں ۔ ان کو تذکرہ نگاروں نے جہاں ان کی شخصی ، علمی ، عرفانی اور روحانی حیثیت سے خراج تحسین پیش کیا ہے ان کی شاعری کی بھی تعریف کی ہے ۔ سراج الدین خان آرزو جیسا فاضل اور بیدار مغزنا قد شاہ گلشن کے شعروں کو اشعار گوہربار کہتا ہے ۔ نہ صرف یہ بلکہ فن شعر میں ان کے فیض صحبت کا ذکر بھی کرتا ہے ۔ مجمع النفائس کی یہ عبارت دیکھیے[2] :

''فقیر سالہا در بندگی ایشاں حاضر شد و اشعار خود می خواند خیلے از راہ لطف تحسین می فرمودند و این خاکسار را می ستودند''

صاحب نشتر عشق نے بھی خان آرزو کے ذکر میں ان کی شاہ گلشن صحبتوں کا ذکر کیا ہے ۔[3] خان آرزو نے ایک اور جگہ لکھا ہے کہ :[4]

''فقیر در مرض موت ایشاں حاضر بود بلکہ در خانہ کہ ایشاں ودیعت حیات سپردند سکونت داشت''

اسی بیان میں آگے چل کر انھوں نے ایک دن خواجہ ناصر عندلیب اور شاہ مبارک آبرو کے ساتھ شاہ گلشن کی صحبت میں جانے اور ان کی مہمان نوازی کا ذکر بھی کیا ہے ۔

شاہ گلشن دہلوی کی شاعری کی اکثر تذکرہ نگاروں نے تحسین کی ہے ۔ مولف

---

۱۔ مخزن الغرائب ، ص ۳۷۶ ب مخطوطہ ۔
۲۔ مجمع النفائس ۔ ص ۳۱۸ الف
۳۔ نشتر عشق حصہ اول ، ص ۱۳ ب
۴۔ مجمع النفائس ۔ ص ۳۱۸ الف

تذکرہ حسینی کہتے ہیں[1] :

''شاہ گلشن ۔ ۔ ۔ از سخن سبحان کامل بود''

غلام علی آزاد بلگرامی کہتے ہیں[2] :

''شاہد سخن را بہ رعنائی بر کرسی می نشاند''

مولف تذکرہ بے نظیر کہتے ہیں :[3]

''تلاش خیالات رنگین دارد''

نواب صدیق حسن خان تذکرہ شمع انجمن میں لکھتے ہیں کہ :[4]

''مطابق تخلص تلاش خیالات رنگین دارد''

صاحب نشتر سخن کہتے ہیں :[5]

''طبع چون گلشن رنگین پیدا کرد''

لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی گل رعنا میں لکھتے ہیں[6] ۔ کہ نثر بھی رنگین لکھتے تھے ۔

شاہ گلشن کی شاعری اور نثر میں رنگین وتاثیران کے پیر و مرشد شیخ عبدالاحد معروف بہ شاہ گل ، ان کے استاد شاعری مرزا عبدالقادر بیدل اور محمد افضل سرخوش کی صحبتوں اور فیضان کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے ۔ شیخ عبدالاحد شاہ گل درویشی و فقر کے جادۂ مستقیم پر ثابت قدمی کے علاوہ میدان شاعری میں بھی اشہب قلم دوڑاتے تھے ۔ اور جب کبھی اشغال باطنی سے فرصت ملتی تھی اس طرف متوجہ ہوتے تھے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے شیخ عبدالاحد شاہ گل کے نام میں شاہ گل کی مناسبت سے حضرت سعد اللہ نے اپنا تخلص گلشن رکھا تھا اس لیے ان تخلصوں کی رنگینی کا ان کے کلام میں آ جانا اور عارفانہ اور بزرگانہ افکار کا مضامین و اسالیب اشعار میں موجود ہونا ایک لازمی امر تھا ۔ مرزا بیدل بھی شاعری میں معرفت کے مضامین لانے کے رسیا تھے ۔ سراج الدین علی خان آرزو مجمع النفائس میں کہتے ہیں کہ شاہ گلشن نے خود مجھ سے کہا تھا کہ تخلص گلشن مجھے مرزا بیدل نے دیا ہے اور میں نے گل و گلشن میں نسبت کو ملاحظہ

---

۱۔ تذکرہ حسینی ، ص ۳۸۴

۲۔ تذکرہ سرو آزاد ، ص ۱۹۹

۳۔ تذکرہ بے نظیر ، ص ۱۰۵-۱۱۱

۴۔ شمع انجمن ۔ تذکرہ شاہ گلشن

۵۔ نشتر سخن ، ص ۴۸۵ الف مخطوطہ

۶۔ گل رعنا مخطوطہ ، ۲۵۲ ب

کرتے ہوئے اسے اختیار کر لیا ۔[1]

شاہ گلشن اور مرزا عبدالقادر بیدل میں بھی ایک خصوصی نوع کا تعلق تھا اس کا ذکر معاصر تذکرہ نگاروں کے علاوہ خود شاہ گلشن نے بھی کیا ہے۔ تذکرہ نگار عام طور پر شاہ گلشن کو مرزا بیدل کا شاگرد کہتے ہیں۔ کلمات الشعرا کے مصنف محمد افضل سرخوش لکھتے ہیں کہ[2] :

''مدّ نے پیش فقیر مشق کردہ ۔ ۔ ۔ آخر بہ صحبت مرزا بیدل ہم جنسیت او را کشید ۔ ۔ ۔ ''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ گلشن پہلے محمد افضل سرخوش سے اصلاح لیتے تھے اور پھر مرزا عبدالقادر بیدل کے شاگرد ہو گئے ۔ سراج الدین علی خان آرزو نے تذکرہ مجمع النفائس میں واضح الفاظ میں لکھا ہے:[3]

''شاہ گلشن ۔ ۔ ۔ شاگرد مرزا بیدل بود''

پھر ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے شاہ گلشن کی زبان الہام ترجمان سے یہ بھی سنا ہے کہ :[4]

''اما آنچہ از زبان ایہام ترجمانش مسموع است ہمیں قدر است کہ مرزا بیدل این تخلص بہ من داد و چون نسبت گل و گلشن ملاحظہ کردم اختیار نمودم و شاید دوسہ جا تغیر در اشعار من کردہ باشد''

لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے بھی گل رعنا میں شاہ گلشن کے اس بیان کو نقل کیا ہے[5] محمد افضل سرخوش کی شاگردی کا ذکر خود سرخوش کے سوا کسی اور تذکرہ نگار نے نہیں کیا لیکن سرخوش کے اپنے بیان کے پیش نظر اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ، انھوں نے ایک دوسری جگہ واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ :[6]

''شیخ سعد اللہ گلشن طبعی درست دارد ۔ مدّ نے پیش فقیر مشق کردہ جنونے بہم رسانده از دارالخلافہ برآمد ۔ الحال در گجرات سیر می برد آخر بہ صحبت مرزا بیدل ہم جنسیت او را کشید''

---

۱۔ مجمع النفائس ، ص ۳۱۸ الف مخطوطہ
۲۔ کلمات الشعرا، ص ۹۶
۳۔ مجمع النفائس ، ص ۳۱۸ الف مخطوطہ
۴۔ مجمع النفائس ، ص ۳۱۸ الف مخطوطہ
۵۔ گل رعنا ، ص ۲۵۲ ب مخطوطہ
۶۔ کلمات الشعرا ، ص ۹۶

اور پھر اسی تذکرے میں انھوں نے شاہ گلشن کے ایک مصرع پر اصلاح کا حال بھی لکھا ہے کہتے ہیں کہ ایک روز شاہ گلشن یہ مصرع کہہ کر میرے پاس لائے:

ع به یک پیمانه چون یاقوت دارم آب و آتش را

میں نے اس پر یہ پیش مصرع لگایا:

ز بس ہا ارم خوئی دام کردم طبع سر کش[1] را

ان تمام بیانات کے اعتبار سے شاہ گلشن کی شاعری پر سہ گونہ اثرات کا پتہ چلتا ہے یوں کہیے کہ ان کی شاعرانہ حیثیت ایک ایسے چراغ کی سی ہے جو سہ جہتی فانوس میں رکھا ہو لیکن خارج میں جس کی روشنی کل مل گئی ہو۔ یہ سہ جہتیں شاہ گل، سرخوش اور بیدل کی ہیں۔ ان سہ جہتوں سے نکل کر یک جہت پیدا کرنے والی روشنی ان اشعار میں دیکھیے:

(۱) برآں از ظلمت تن تا که نور جاں شود پیدا
ز جاں بگزر دلا چوں من که تا جانان شود پیدا[2]

(۲) بدل شوخی نفس در دیده طغیان می کند نازش[3]
پری در شیشه پنهان گشت و بیرون است پروازش

ے گشتم شهید تیغ تغافل کشیدنت
جانم ز دست برد غزالانه دیدنت

ے حیرت بهار گلشن نظاره خودم
آئینه خانه دل صد پاره خودم

ے ز شوق مهر رُخسارے که چشم گریه پیدا شد
چو گوهر در گره هر اشک من دارد سحرگاهی

---

۱- کلمات الشعرا، ص ۹۶، ۹۷ -

۲- ریاض العارفین، ص ۲۱۲ -

۳- کلمات الشعرا، ص ۹۶، ۹۷ -

(۳) بچشم خویش نگر سحر سامری این است
نظر به آئینه کن شیشه و پری این است[1]

(۴) ماه و سالم بے تو در روز سیه مشهور بود[2]
چون نگاه کور عمر من شب دیجور بود

ے جفا جوئی که من از شوق او عمریست دل تنگم
فسان تیغ نازش نیست جُز گردیدن رنگم

ے کے تردّد تیز طبعان را کند زیر و زبر
آمد و رفتی نمی باشد دم شمشیر را

ے ز بس کرده موزونش گل زهر مُو
درخت رباعی ست آن چار ابرو

ے ز شوق مهر رُخسارے که چشم گریه پیدا شد
چو گوهر در گره هر اشک من دارد سحرگاهی

(۵) بدرش رفته سجده ها کردم
منت پائے ماست بر سر ما[3]

ے سخت جانان نیستند از چاره سازان کامیاب
مومیائی نفع کے بخشد شکست سنگ را

ے کلک من صورت کش صد معنی رنگین نو است
گر کند گلشن تخلص بلبل طبعم روا است

شاہ گلشن کا قلم واقعی ''صورت کش صد معنی رنگین'' اور ''نوا کش مانند بلبل رنگین نوا'' ہے۔ مولف ریاض العارفین ان کے طرز کلام کے متعلق لکھتے ہیں کہ[4] :

''در شاعری طریقہ اهل هندوستان را می سپارد''

۱۔ سرو آزاد ، ص ۱۹۹ ۔

۲۔ تذکرہ بے نظیر ، ص ۱۰۰ ، ۱۰۱ ۔

۳۔ میخانہ درد : تذکرہ شاہ گلشن ۔

۴ ۔ ریاض العارفین ، ص ۲۱۲ ۔

یہ بلبل رنگیں نوا اگرچہ روز یک شنبہ یکم جمادی الاول ۱۱۴۱ھ کو ۶۵ سال گلشن فانی میں گزارنے کے بعد نخل برزخ پر جا بیٹھا[1] اور ظاہرہ طور پر اجمیری دروازہ (دہلی) کے باہر حضرت خواجہ قطب الدین کے مزار کے راستہ[2] میں مدفون ہوگیا لیکن[3] اپنے پیچھے ادب و شعر کی کچھ ایسی روایتیں ، حکایتیں اور نصیحتیں چھوڑ گیا جس سے کہ نہ صرف گلستان فارسی پر مزید نکھار آیا بلکہ اس میں ریختہ کا ایک نرالا خیال بھی جلوہ گر ہوا جودنوں میں ایسا تن آور درخت بن گیا کہ سارے چمنستان پر محیط ہوگیا ۔

دہلی کا یہ گلشن (شاہ گلشن دہلوی) جس نے کتم عدم سے برہان پور میں وجود اختیار کیا ۔ دلّی میں آ کر وحدت کے گاؤں سے گلشن بنا[4] اور یہیں خزاں کی پت چھڑ کی نظر ہوگیا اپنے پیچھے کچھ ایسے چمن چھوڑ گیا جن کی خوشبو سے زبان و ادب ریختہ کے مشام ایک عرصہ تک معطّر رہے ۔ جس طرح پیوند لگانے سے اصل پھل اور پھول کی ساخت اور مزا بدل جاتا ہے اسی طرح گلشن ادب و شعر کی نئی شجرکاری کے دوران ایک پیوندی پودا ایسا بھی لگا جس کے سدا بہار پھول اور مرغوب طبائع پھل آج تک اہل ذوق کے کام و دہن کی لذت کا سامان فراہم کر رہے ہیں ۔ میری مراد ان چند لوگوں سے ہے جنھوں نے فارسی میں ہندوی (قدیم اردو) کا پیوند لگا کر ادب و شعر کی محفل کو ریختہ کے سدا بہار گلدستوں سے سجایا ۔ ان میں جناب شمس اللہ ولی گجراتی ، سراج الدین علی خان آرزو ، خواجہ میر درد اور کسی حد تک مرزا مظہر جانجان کے نام اہم ہیں ۔ یہ لوگ بالواسطہ یا بلاواسطہ شاہ گلشن دہلوی کے صحبت یافتہ ہیں اور ائمّہ ریختہ گوئی میں شمار ہوتے ہیں ۔ میدان ریختہ میں جس شاعر کے قدم راست شاہ گلشن دہلوی کی نصیحت کی بنا پر پڑے ہیں وہ اردو شاعری کے باوا آدم شمش الدین ولی گجراتی (احمد آبادی ، دکنی یا اورنگ آبادی کچھ کہیں) کے قدوم میمنت لزوم ہیں ۔

---

۱۔ گل رعنا ، ۲۵۲ ب ۔ سرو آزاد ، ص ۱۹۹ ۔

۲۔ مقالات شروانی مضمون اشکی الہی ، ص ۱۱۷ ۔

۳۔ حالات و مقامات مرزا مظہر جانجان ، ص ۵۸ ۔
ریاض العارفین میں وفات کا سن ۱۰۱۴ھ دیکھنے میں آیا ہے جو صریحاً کاتب کی غلطی ہے ۔ بندرا بن خوش گو کے اس مصرع سے ۱۱۴۱ھ ہی نکلتا ہے
ع جائے گلشن بہ بہشت ابدی

۴۔ ''شاہ گلشن'' کے پیر کا نام تھا شاہ گل اور تخلص تھا وحدت ۔

وہ اوّلین نقوش ہیں جن پر بعد میں دوسروں نے اپنے قدم رکھے ہیں اور یہی وہ اہم بات تھی جس کے پیش نظر محمد حسین آزاد نے آب حیات میں ولی کو اردو شاعری کا موجد اور باوا آدم کہا ہے ورنہ اردو شاعری اپنی قدیم شکلوں میں تو کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی صورت میں موجود ہی تھی۔ اسے اُردوئے معلّٰی شاہجہان آباد کی شکل ولی ہی کے فیضات شعر سے ملی ہے۔

ولی سے پہلے اُردو زبان کی جو شکل موجود تھی وہ دکنی اور گجراتی کہلاتی تھی۔ یہ زبان دہلی یا شمالی ہند میں رائج اُردوئے معلّٰی سے کافی حد تک مختلف تھی۔ یہ وہ زبان تھی جس کے متعلق اہل دہلی نے اچھے الفاظ استعمال نہیں کیے اور اسے لچر اور پوچ زبان کہا ہے۔ اس لیے اس زبان کے شاعروں کو بھی اہل دہلی نے کوئی وقعت نہیں دی ہے۔ میر تقی میر نے تذکرہ نکات الشعرا میں یہ بات تسلیم کرنے کے باوجود کہ ریختہ کا آغاز دکن سے اس میں کسی دکنی شاعر کا ذکر نہیں کیا کیونکہ ان کے نزدیک دکن سے کوئی مربوط شاعر نہیں اٹھے۔ ان کی رائے دیکھیے[1] :

''اگرچہ ریختہ در دکن است چون از آنجا یک شاعر مربوط نہ خاستہ لہذا شروع بنام آنہا نہ کردہ''۔

اسی تذکرے میں ایک اور مقام پر میر تقی میر نے دکنی شاعروں کو ''پُر بے رتبہ'' کہا ہے۔

قائم الدین قائم نے تذکرہ مخزن نکات لکھا تو انھوں نے بھی اس میں دکنی اور ریختہ کے تعلق کو تسلیم کیا لیکن اپنے ایک شعر میں دکنی پر انھیں بھی تبرّا کہنا پڑا۔ ایک شعر میں کہتے ہیں :

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

میر حسن نے بھی تذکرۃ الشُعرا میں ان دو بزرگوں کا ساتھ دیا ہے وہ حبیب اور حسن تخلص کے دو دکنی شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں[2] :

---

۱۔ نکات الشُعرا حرف آغاز۔

۲۔ تذکرۃ الشُعرا میر حسن (تذکرہ میر حسن) بحوالہ شعرا ہند، ص ۲۵، جلد ۱۔

''اکثر اشعار این ها در بحر کبت به نظر آمده چون الفاظش ربط یک دیگر نداشتند بقلم نیاوردم'' ۔

زبان و بیان کی یہی وہ بےربطی اور بےناموسی تھی جس نے دکنی زبان کو رفتہ رفتہ تحلیل کر دیا اور اس کی جگہ جنوبی ہند میں بھی اُردوئے معلّٰی شاہجہان آباد کا علم بلند ہوگیا ۔ شمالی ہند کے ریختہ گو شاعروں اور نقّادوں نے جن دکنی شعرا کو قابل اعتبار سمجھا ہے وہ وہی ہیں جن کی شاعری پر شمالی ہند کی زبان یا اُردوئے معلّٰی شاہجہان آباد کا رنگ چڑھ گیا تھا ۔ ان میں سرفہرست نام ولی کا ہے اور پھر عبدالولی سراج اور آزاد ناموں اور تخلصوں کے بڑے شاعر دکھائی دیتے ہیں ۔ چنانچہ میر تقی میر نے تذکرہ نکات الشعرا میں ان کی شاعری کے با اعتبار اور مربوط ہونے کے سلسلے میں لکھا ہے کہ[1] :

''مخفی نماند کہ احوال یکے از شاعران سمت دکن کہ پرُبے رتبہ اند مگر بعض چنانکہ ولی ، سید عبدالولی ، سراج و آزاد کہ معاصر ولی بود سررشتہ مربوط گوئی بدست ایشان یافتہ می شود سرکلافہ داشت'' ۔

یہ مربوط گوئی زمانہ ولی کے تقاضے اور زبان دلّی کی طرف رجحان ہی کا نتیجہ تھا ۔ چنانچہ قدیم تذکروں میں تذکرہ نگاروں نے اس ضرورت اور تبدیلی کی طوف اشارہ بھی کیا ہے ۔ قیام الدین قائم نے تذکرہ مخزن نکات میں ایک شاعر احمد گجراتی کے ذکر میں کہا ہے[2] :

''شعر ہندی می گفت کہ عبارتے از . . . . دوھرہ باشد . . . . چون معاصر ولی بود گاھے گاھے فکر شعر در ریختہ نیز می نمود'' ۔

اسی طرح وہ فخری تخلص کے ایک شاعر کے متعلق کہتے ہیں[3] :

''فخری تخلص شخصے بود از شاگردانِ ولی بسیار بہ صفا می گفت چنانچہ از سیاق و سباق کلامش پیدا است'' ۔

فراقی کے ذکر میں میر تقی میر نے کہا ہے کہ[4] :

---

۱۔ نکات الشعرا ، ص ۹۴ ۔
۲۔ مخزن نکات ، ص ۸
۳۔ مخزن نکات ، ص ۸ ۔
۴۔ نکات الشعرا ذکر فراقی ۔

''فراقی تخلص که بنده از احوالش کما ینبغی اطلاع ندارم در آں ایام که محمد یار خان صوبه دار دهلی بود هر دو باتفاق برائے دیدن ولی بدارالخلافت آمدند چون نسق کلامش بناہر کثرت صحبت خاطر نشین این ها گردید تتبع او کشید چنانچه از رویه اشعار این دو بزرگوار پیدا است'' ۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ جنوبی ہند کی اُردو شاعری میں ''رویہ درست'' دہلوی زبان و بیان کے اثرات کا نتیجہ ہے ۔ میر تقی میر نے بعض جگہ کسی شاعر کے متعلق ''بسیار بدرستی حرف می زند'' کے الفاظ لکھے ہیں ۔ یہ رویہ درست یا ''نادرست حرف زدن'' چاہے جنوب میں ہو یا شمال میں ، صرف ولی گجراتی کے اجتہاد زبان و بیان کا نتیجہ ہے ، اور ان کا یہ اجتہاد اپنے عہد کے مشہور فارسی شاعر اور درویش شاہ گلشن دہلوی کے رشد و ہدایت کا نتیجہ تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو اُردو نہ جانے کب جا کر اپنے لیے وہ جگہ بناتی جو اس نے محمد شاہی عہد ہی میں بنا لی تھی ۔ اس لیے اُردو کے اوّلین محسن اگرچہ ولی نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ محسن شاہ سعد اللہ گلشن ہیں ۔ اگر وہ ہدایت نہ دیتے تو جنوب میں دکنی شاعری نہ جانے کب تک اسی طرح بے مربوط ، بے اعتبار او لچر سی رہتی ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے اور شمال میں بھی ریختہ کے آغاز کا موقع اتنی جلدی ہاتھ نہ آتا ۔

غلام علی آزاد بلگرامی نے سرو آزاد کے تتمہ میں اور قدرۃ اللہ قدرت نے تذکرہ قدرت میں لکھا ہے کہ شاہ گلشن نے ولی کے قیام دہلی کے دوران انھیں مشورہ دیا تھا کہ :

''شما زبان دکنی در گذاشته ریخته را موافق اُردوئے معلّٰی شاهجهان آباد موزون کنید تا موجب شهرت و رواج قبول خاطر صاحب . . . . عالی مزاج گردد'' ۔

میر تقی میر نے اس نصیحت گلشن کو تذکرہ نکات الشعرا میں ان الفاظ میں درج کیا ہے[۱] :

''این همه مضامین فارسی که بیکارافتاده اند درریختهباید بهکار برد. از تو که محاسبه خواهد گرفت'' ۔

---

۱۔ نکات الشعرا ، ص ۹۴ ۔

شاہ قدرت اللہ قدرت کے مذکورہ بالا بیان سے تو صاف ظاہر ہے کہ شاہ گلشن دہلوی صرف ریختہ کو مزاج زمانہ کے مطابق خیال کرتے تھے ایسا ریختہ جو اُردوئے معلّٰی شاہجہان آباد کا مزاج رکھتا ہو اور ان کے نزدیک یہی وہ طرز تھی جو قبول عام اور شہرت دوام حاصل کر سکتی تھی۔ نکات الشعرا میں درج نصیحت گلشن تو محض ولی کے ذہن سے اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے تھی کہ دکنی سے ریختہ کی طرف، غیر مربوطی سے مربوطی کی طرف اور نادرستی سے درستی کی طرف فوراً کیسے آیا جائے۔ یہ نصیحت ولی کو اس رکاوٹ کو پھلانگنے میں بڑی مددگار ثابت ہوئی اور انھیں فوراً خیال آ گیا کہ فارسی اور فارسی غزل و شعر میں جو الفاظ و بیان اور مضامین و معانی کا بے شمار ذخیرہ موجود ہے وہ میرے لیے مشعل راہ کا کام دے سکتا ہے۔ چنانچہ ولی نے اسی نصیحت سے حوصلہ پا کر فارسی کی صدیوں کی روایات زبان و بیان اور سرمایہ مضامین و معانی کو رہبر و راہنما مان کر جو سفر کا آغاز کیا تو سالوں کی مسافت دنوں میں طے ہوگئی اور تھوڑے ہی عرصے میں ولی نے اپنا نیا دیوان اُردوئے معلّٰی شاہجہان آباد کے رنگ میں ترتیب دے کر دلّی بھیجا جس سے ہر طرف ریختہ کا غلغلہ بلند ہوگیا۔

شاہ گلشن کی نصیحت پر عمل کر کے یک دم ایک نئی زبان میں مشق سخن کرنا اور پھر اس زبان میں مکمل دیوان ترتیب دے لینا کوئی آسان بات نہ تھی خصوصاً ایسے حالات میں جب اس کے نمونے موجود نہ تھے اور شمالی ہند کے لوگ اور شاعر خود اُردوئے معلّٰی شاہجہان آباد میں شعر شنیدی اور شعرگوئی سے نا آشنا تھے۔ کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جو کبھی کبھار شکست و ریختہ زبان دلّی میں کچھ کہہ لیتے تھے ورنہ اس لحاظ سے عام خاموشی تھی بلکہ ابتدا میں تو خود ریختہ کی طرف متوجہ ہونے والے دہلوی شاعر اس فن نو یعنی ریختہ گوئی کو فارسی کے مقابلے میں بے اعتبار سمجھتے تھے۔ چنانچہ میر تقی میر تذکرہ نکات الشعرا میں سراج الدین علی خان آرزو کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں[1]:

"گاہے برائے تفنن طبع دو سہ شعر ریختہ فرمودہ ایں فن بے اعتبار را کہ ما اختیار کردہ ایم اعتبار دادہ اند"

یہاں میر نے ریختہ کو فن بے اعتبار کہا ہے۔ اس احساس کو کم بلکہ ختم کرنے میں ولی کے اس دیوان نے جو شاہ گلشن کی رشد و ہدایت کے مطابق انھوں

---

۱۔ نکات الشعرا، ص ۳۔

نے لکھا تھا اہم اور بنیادی کام کیا ہے ۔ جب شاہ گلشن نے ولی کو اردو کی طرف منتقل ہونے کی نصیحت کی تھی تو ولی نے ایک شعر نمونے کے طور پر وہیں کہہ کر پیش کر دیا تھا جس سے ان کے باصلاحیت ہونے اور لئی مہم کو سر کرنے کے عزم ، حوصلہ ، یقین اور قابلیت کا اندازہ ہو گیا تھا ۔ وہ شعر یہ ہے ۔[1]

خوبی اعجاز حسن یار گر انشا کروں
بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں

دکنی زبان کی ''لچری'' کے مقابلے میں اس شعر میں جو ثقاہت ہے وہ ہر ذوق سلیم رکھنے والے پر عیاں ہے ۔

ولی جس سن میں دہلی آتے ہیں وہ اورنگ زیب عالم گیر کی آخری حکمرانی کا زمانہ ہے یعنی ۱۱۱۲ھ - ۱۱۱۳ھ یا قریباً ۱۷۰۰ عیسوی کا ——————— اورنگ زیب عالم گیر ۱۷۰۷ء میں فوت ہوتے ہیں ۔ اس دور ہی میں شاہ گلشن کا ولی کو اردوئے معلی کی طرف راغب کرنا اور ولی کا اس طرف راغب ہو جانا ایک بہت بڑی لسانی اور سیاسی اہمیت کا حامل ہے ۔ میر تقی میر نے ولی کی آمد کا زمانہ تو متعین نہیں کیا ۔ البتہ اتنا لکھا ہے کہ[2]

''می گویند ولی در شاہجہان آباد (دلی) نیز آمدہ بود بخدمت میاں گلشن صاحب رفت و از اشعار خود پارہ خواند میاں صاحب فرمود این ہمہ مضامین فارسی کہ بے کار افتادہ اند در ریختہ خود بکار ببرازتو کہ محاسبہ خواہد گرفت''

قیام الدین قائم مخزن نکات میں ولی کے دہلی میں آنے کا سن چہل و چار از جلوس عالم گیری لکھا ہے ۔[3] اور یہ کہا کہ وہ اس سن میں ایک سید زادے شاہ ابوالمعالی کے ساتھ شاہ جہان آباد آئے تھے ۔ نیاز فتح پوری نے رسالہ نگار کے ولی نمبر میں ولی[4] سے پہلے سفر دہلی کا سن ۱۱۱۳ھ ہی لکھا ہے ۔ شاہ معالی ان کے ساتھ تھے یا یوں کہیے کہ وہ شاہ معالی کے ساتھ تھے کیونکہ شاہ معالی ولی کے مجرب بھی تھے ۔ قاضی نور الدین حسین خان فائق نے تذکرہ مخزن الشعرا میں ولی کا تعلق احمد آباد سے بتایا ہے جو گجرات کے علاقہ میں ہے اور سید معالی بھی اسی علاقے سے تعلق رکھتے تھے ۔ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی نے گلشن گفتار میں کہا ہے کہ[5]

---

۱- مخزن نکات ص ۱۰
۲- نکات الشعرا ۔ ص ۹۰
۳- مخزن نکات ۔ ص ۱۰۱
۴- مخزن الشعرا تذکرہ ولی
۵- گلشن گفتار ۔ ص ۸

"ولی بجانب سید معالی کہ از مشائخ زادہ ہائے گجرات بودند میلے تمام داشت"

قیام الدین قائم بھی کہتے ہیں "درسن چہل و چار از جلوس عالم گیر بادشاہ ہمراہ میر ابوالمعالی نام سید پسرے کہ دلش فریفتہ او بود جہاں آباد آمد"[1]
خواجہ خان حمید اورنگ آبادی تذکرہ گلشن گفتار میں ولی کے خاص برہان پور میں قیام کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں[2]: "ولی ——— در بلدہ درالسرور برہان پور نیز مدتے سکونت داشت و بہ جانب میاں سید معالی کہ از مشائخ زادہ ہائے گجرات بود میلے تمام داشت"۔

یہ سید ان شاہ ابوالمعالی سے مختلف معلوم ہوتے ہیں جن کا مزار لاہور میں ہے۔ ان کا دارالشکوہ نے اپنے مشہور تذکرہ سفینۃ الاولیا میں یوں تعارف کرایا ہے[3]۔

"از سادات صحیح النسب و صاحب کرامات و خوارق بودہ اند۔ در سلسلہ عالیہ قادریہ مرید شیخ داؤد جہنی وال اند و بعد از سی سال ریاضت و مجاہدات در شہر لاہور سکونت ورزیدند۔"

داراشکوہ نے ان کا سال پیدائش ۹۶۰ھ اور سال وفات ۱۰۲۴ھ لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا مزار لاہور میں ہے، مؤلف خزینۃ الاصفیا نے ان کے حسب و نسب کی مزید وضاحت یوں کی ہے[4]۔

"وفات بقول صاحب شجرہ چشتیہ در سال ۱۱۱۶ھ و صاحب شجرہ سال وفات وے از مادہ "شہنشاہ مجتبیٰ" (۱۱۱۶ھ) اخذ نمودہ است۔ از سادات عظام و خلفائے کرام شیخ داؤد چشتی است اگرچہ ارادت بہ خدمت شیخ محمد صادق گنگوہی داشت اما تکمیل از شیخ داؤد یافت و خرقہ خلافت پوشید۔ پدرعالی قدروے سید محمد اشرف در قصبہ امٹھ متصل سہارن پور سکونت داشت چون او وفات یافت و حضرت شاہ خورد سال بماند والدہ اش او را نزد شیخ محمد صادق گنگوہی برد برائے تربیت و تکمیل وے التجا نمود۔ شیخ او را نزد خود داشت"۔

---

۱۔ مخزن نکات، ص ۱۰
۲۔ گلشن گفتار۔ ص ۸
۳۔ سفینۃ الاولیا۔ ص ۱۹۵
۴۔ خزینۃ الاصفیا، ص ۴۸۴ - ۴۸۵

صاحب حدیقۃ الاولیا نے کہا ہے کہ[1] ''مشہور بزرگ شاہ بھیک چشتی اور شیخ عبدالرشید جالندھری انہی کے خلیفہ تھے'' ۔

ولی شاہ گلشن کی نصیحت کے بعد اپنے وطن واپس چلے جاتے ہیں اور پھر محمد شاہی عہد میں دوبارہ دلی آتے ہیں ۔ یہ ۱۷۲۲ء کا زمانہ ہے[2] اور اس بار ان کا مرتب کردہ دیوان ریختہ آن کے ساتھ تھا ۔ ولی کی پہلی آمد دھلی اور دوسری آمد میں تقریباً بائیس سال کا عرصہ ہے ۔ معلوم ہوتا ہے دکنی سے ریختہ کی طرف عنان شعر موڑنے میں انہیں کافی دقتوں کا سامنا ہوا ہے لیکن ایک عشق اور ایک جذبہ سے جس کا انہوں نے اس شعر میں ذکر کیا ہے اس سفر کو آسان بنا دیا تھا ۔

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

مصحفی کے بقول یہ محمد شاہ کے جلوس کا دوسرا سال تھا جب ولی اپنے دیوان کے ساتھ دوبارہ دھلی آئے[3] ۔ اور ان کی شاعری اس شعر سے کہ :

ترے بن مجھ کو اے ساجن تو گھر اور بار کیا کرنا
اگر تو نا اچھے مجھ کو یہ سنسار کیا کرنا

اس شعر تک سفر کر چکی تھی[4] ۔

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن
باعث خمیازۂ آغوش ہے

محمد شاہی عہد کی یہ دلّی اپنی پوری تاریخ میں منفرد حیثیت کی حامل تھی ۔ رزم آرائی کی جگہ بزم پسندی آ چکی تھی ۔ انتشار و جنگ و جدل کی فضا میں ہر شخص سکون کا متلاشی (تلاشی) تھا ۔ تکیے ، داڑے ، عرس ، تماشے ، میلے ، خانقاہیں ، سیر و تفریح ، درد مندی ، دل سوزی ، غم پرستی ، حسن تلاشی ، عشق اختیاری ، بزم آرائی ، شعرگوئی ، نشاط انگیزی درویشی اور درویش منشی

---

۱۔ حدیقۃ الاولیا ، ص ۵۲
۲۔ سالنامہ رسالہ نگار ۔ اصناف سخن نمبر ، ص ۵
۳۔ تذکرہ ہندی گویاں، ص ۸۰
۴۔ غزل گوئی ولی سے عہد حاضر تک (سالنامہ نگار ۱۹۵۷ء) از نیاز فتح پوری ۔ ص ۵

اس دور کی دلّی کی خصوصی روایات میں سے تھیں ۔ نواب درگاہ قلی خان ، آنند رام مخلص ، بندرا بن خوش گو ، سیر و تماشا اور اعراس بزرگان پر لکھنے والے دوسرے مصنفین کی کتابوں اور رسائل سے دلّی کے ادبی ، شعری اور سماجی مزاج کا پتہ چلتا ہے ایسے مزاج کے شہر میں دیوان ولی یوں پھیلا جیسے خشک جنگل میں آگ پھیل جاتی ہے ، ادب و شعر کے لیے نئی زبان نیا چٹخارا جس طرف اس کا تیر گیا اسی کو مارا ۔ چنانچہ قیام الدین قائم مخزن نکات میں لکھتے ہیں[1] :

''بالجملہ ہمیں تفوّل زبان ایشان سخن ابن بابا چنان حسن قبول یافت کہ بیت دیوانش روشن تر از مطلع آفتاب گردیدہ ریختہ را قسمے بفصاحت و بلاغت می گفت کہ اکثر استادان آن وقت شعر ریختہ موزون می نمودند''

اور پھر لکھتے ہیں کہ مشہور فارسی گو شاعر مرزا عبدالقادر بیدل بھی اتنے متاثر ہوئے کہ ایک دو شعر ریختہ میں انھوں نے بھی کہہ ڈالے ۔

مت پوچھ دل کی باتیں یہ دل کہاں ہے ہم ہیں
اس جنس بے نشاں کے حاصل کہاں ہیں ہم ہیں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
اندر سے یار بولا بیدل کہاں ہیں ہم ہیں

پھر ان کے ساتھ امیر خان انجام ، مولوی خان فطرت ، سراج الدین علی خان آرزو اور دوسرے استادان شعر فارسی بھی تبرکاً شامل ہو گئے ۔ اس وقت تک دلّی کے شاعروں کے لیے ریختہ کا اسلوب اور اظہار بیان بیگانہ تھا وہ فارسی کی اسالیبی روایات کے سمندر میں اس حد تک غرق ہو چکے تھے کہ اس کی تہ سے اچھل کر ریختہ کے کنارے تک آنا ان کے لیے ایک بڑا مشکل کام نظر آتا تھا۔ عام لوگ چونکہ فارسی سے نابلد تھے اور اردو ان کے منہ لگ چکی تھی اس لیے اردو میں غزل اور دیوان غزلیات کا مرض وجود میں آ جانا ان کے لیے نعمت غیرمترقبہ کے طور پر تھا ۔ زبان و اسلوب کے مقامی مصالحہ نے ان کو وہ چٹخارا دیا کہ گھر گھر اور قریہ قریہ اس کی شہرت اور مانگ ہوگئی۔ غلام ہمدانی مصحفی تذکرہ ہندی گویاں میں شاہ ظہور الدین حاتم کی زبان سے روایت کرتے ہیں کہ :[2]

''نقل می کرد کہ در سن دوئم فردوس آرام گاہ دیوان ولی در شاہ جہان آباد آمدہ و اشعارش بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ''

محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اسی پس منظر میں لکھا ہے کہ جب ان کا

---

۱۔ مخزن نکات ، ص ۱۰
۲۔ مخزن نکات ، ص ۸۰

دیوان دلّی پہنچا ہے تو لوگوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور شہر شہر اور گاؤں گاؤں لے گئے ہیں - فردوس آرام گاہ محمد شاہ کے دور کے کئی استاد شاعر بھی اس نعمت غیرمتوقع کی طرف تیزی سے لپکے ہیں اور اس کو چکھنے کی کوشش کی ہے - ایسے اساتذہ میں شاہ مبارک آبرو ، سراج الدین علی خان آرزو ، شیخ شرف الدین مضمون ، مصطفیٰ خان یک رنگ اور شاہ ظہور الدین حاتم وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں - شاہ ظہور الدین حاتم نے تو خود کہا ہے کہ[1] انھوں نے عام زبان یعنی اُردو (ریختہ) میں لکھنے کا اس وقت فیصلہ کیا جب ولی کا دیوان دلی پہنچا اور پھر انھوں نے اپنی تیرہ (۱۳) غزلوں کے متعلق کہا ہے کہ یہ انھوں نے ولی کے تتبّع میں لکھی ہیں - تذکرہ بے جگر میں حاتم کے علاوہ آبرو اور فغاں کی پیروی ولی کا ذکر ہے- لکھا ہے کہ :[2]

''چون در سنہ اثنا جلوس محمد شاہی دیوان او بہ دلّی رسید موزوں طبعان بلند فکر مطالی تلاشان ہم عصر مثل حاتم ، آبرو و فغاں وغیرہ بہ تتبع زبانش پیرو ہم زبان شدند''

اہل تحقیق نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس وقت دلّی کے شاعر صرف ولی کی غزلوں پر غزلیں لکھنا ہی باعث فخر خیال کیا کرتے تھے بلکہ ان کے دیوانوں سے اپنے مشاعروں کے لیے بھی طرح مصرع حاصل کرتے تھے -[3]

غلام ہمدانی مصحفی کے تذکرۃ الشعرا بنام تذکرہ ہندی گویاں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ولی کا یہ اثر شمالاً جنوباً گردش کرتا رہا ہے - جنوب والے شمال میں اور شمال والے جنوب میں ان اثرات کو منتقل کرنے کا سبب بنے ہیں - مصحفی کے تذکرے میں شاعروں کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چودہ پندرہ دکنی شاعر شمال آئے تھے - اعظم الدولہ سرور کے تذکرہ سرور سے بھی یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے - مصحفی کے تذکرے سے تیس کے قریب شمالی ہند کے ایسے شاعروں کے نام بھی ہاتھ آتے ہیں جو دکن گئے تھے -

خوگر نہیں کچھ یونہی ہم ریختہ گوئی کا
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

---

۱- رسالہ اُردو ، آٹھویں جلد ، ص ۵۳/۵۲/۲۸ مضمون ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصانیف ترجمہ از گارساں دتاسی

۲- تذکرہ بے جگر بحوالہ مخطوطہ انڈیا آفس ، ص ۱۸۵

۳- دکنی کا اثر شمالی ہند پر از محی الدین زور ، رسالہ اُردو ، نویں جلد ، ۱۹۲۹ء

فقیر اللہ آزاد ، میرزا داؤد ، داؤد ، مہر عبدالولی عزلت ، عارف الدین عاجز ، سید حمزہ علی حمزہ ، فخری دکنی ، سراج اورنگ آبادی ، احمد گجراتی دکن کے ایسے ہی شاعر تھے جن پر ولی کا اثر تھا ۔ فخری کو تو قیام الدین قائم نے ولی کا شاگرد کہا ہے ۔[۱]

ولی اور گلشن کے اس رابطے اور تعلق کی بنا پر جس کا ذکر تفصیل سے ہوا ہے بعض نے ولی کو شاہ گلشن کا مرید اور بعض نے شاگرد لکھ دیا ہے لیکن ولی خود کہتے ہیں کہ میں محمد نور الدین صدیقی سہروردی کے مریدوں کا خاک پا ہوں اور شاہ گلشن کا شاگرد ۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں یہ بیان دے کر یہ لکھا[۲] ہے کہ اس سے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ شاہ گلشن کے کس امر میں شاگرد تھے ۔ یعنی تصوف میں یا شاعری میں ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ولی کو شعر اور تصوف دونوں میں ان سے فیضان پہنچا ہے ، کیونکہ ولی محض شاعر ہی نہ تھے بلکہ تصوف اور معرفت کے حامل خاندان سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے ایک رسالہ نور المعرفت کے نام سے بھی لکھا ہے ، جو محمد حسین آزاد کے قول کے مطابق معرفت کے موضوع پر[۳] ہے لیکن بعض نے اس کے موضوع سے اختلاف کیا ہے ۔

قاضی نور الدین حسین خان فائق اپنے تذکرہ مخزن شعرا میں لکھتے ہیں کہ[۴] :

''از رسالہ نور المعرفت کہ تصنیف وے (یعنی ولی) است مستفاد می شود کہ از شاگردان شاہ گلشن و مرید جناب معارف آگاہ مخدوم العالم محمد نور الدین صدیقی السہروردی است''

انشاء اللہ خان انشا نے دریائے لطافت میں جہاں بی نورن اور میر غفر غینی کا مکالمہ لکھا ہے وہاں بی نورن کہتی ہیں :[۵]

''ریختے میں استاد میاں ولی ہوئے اور ان پر توجہ شاہ گلشن کی تھی''

مقالات گارساں دتاسی جلد دوئم میں بھی ولی کو شاہ گلشن کا شاگرد ہی کہا گیا ہے[۶] اور شاگردی کا یہ ناتہ محض اس نصیحت کی بنا پر ہے جو شاہ گلشن نے

---

۱۔ مخزن نکات ، ص ۸
۲۔ آب حیات ، ص ۹۳
۳۔ آب حیات ، ص ۹۳
۴۔ مخزن الشعرا ، ص ۱۱۱
۵۔ دریائے لطافت ، مکالمہ بی نورن غفر غینی
۶۔ مقالات گارساں دتاسی ، ص ۱۶۳

ولی کو دکنی سے ریختہ کی طرف منتقل ہونے کے لیے کی تھی اور کچھ راہنمائی اور راہبری بھی فرمائی تھی - اور یہ انتقال زبان کی نصیحت اور راہنمائی اور اس پر عمل درآمد کوئی آسان کام نہ تھا کیونکہ جنوب میں دکنی ہردلعزیز تھی اور شمال میں فارسی کم از کم شاعروں ادیبوں اور عالموں کی حد تک - - - جس طرح شمال والے دکنی کو لچر، بے رتبہ، فرومایہ خیال کرتے تھے- شمال میں خود شمال والے فارسی کے مقابلے میں ریختہ کو فرو مایہ تصور کرتے تھے اور جو کوئی اس طرف مائل ہوتا تھا اسے ثقہ شاعر نہیں سمجھتے تھے - اس کے اشارے قدیم تذکرہ نگاروں کے تذکروں اوراشاروں میں مل جاتے ہیں - مثال کے طور پر میر تقی میر ، سراج الدین علی خان آرزو کے ذکر میں کہتے ہیں[1] :

''گاہے برائے تفنن طبع دو سہ شعر ریختہ فرمودہ این فن بے اعتبار را کہ ما اختیار کردہ ایم اعتبار دادند''

یہاں میر تقی میر نے ریختہ گوئی کو فن بے اعتبار اسی پس منظر میں کہا ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے اس احساس کو کم بلکہ ختم کرنے میں ولی کے اس دیوان نے جو انھوں نے شاہ گلشن کی نصیحت کے مطابق اردوئے معلی شاہجہان آباد میں تصنیف کیا تھا اہم اور بنیادی کام کیا ہے -

اس زمانے کی دہلی کے مشہور فاضل، ادیب اور شاعر جناب سراج الدین علی خان آرزو کا تعلق بھی شاہ گلشن سے رہا ہے اور یہ شاہ گلشن ہی وہ بزرگ اور استاد ہیں جن کی صحبت میں تقریباً سارے ابتدائی شاعر پروان چڑھے ہیں - ولی کے دیوان کے اثرات کے ساتھ ساتھ سراج الدین علی خان کی شخصیت اور ذات کے اثرات نے بھی اردو شاعری کے دہلی میں رواج پانے میں بڑی تقویت بخشی ہے - سراج الدین علی خان آرزو شاہ گلشن سے تعلق کے سلسلے میں خود اپنے تذکرۃالشعرا بنام مجمع النفائس میں لکھتے ہیں کہ :[2]

''فقیر در مرض موت ایشان حاضر بود بلکہ در خانہ کہ ایشان ودیعت حیات سپردند سکونت داشت''

مولف نشتر عشق نے شاہ گلشن کی صحبت میں خان آرزو کے جانے اور شعر و شاعری کے فن سے متعلق ہونے کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے -:[3]

---

۱- نکات الشعرا ، ص ۳

۲- مجمع النفائس مخطوطہ ، ص ۳۱۸ الف

۳- نشتر عشق مخطوطہ ، ص ۱۳۰ ب ، حصہ اول

''بامصاحبان سخن سنج مثل شاہ گلشن . . . اوقات بہ فکر شعر می گذارد''

شاہ گلشن دہلوی ، جو جنوبی ہند سے آنے والے ولی نامی ایک شاعر کو ریختہ کی طرف توجہ کرنے کی نصیحت کرتے ہیں وہ اپنے قرب و جوار میں بسنے والے اور ہم صحبتوں کو کیوں نہ اس کی تلقین کرتے ہوں گے۔ خان آرزو جیسے شخص کا فارسی سے اردو شعر گوئی کی طرف متوجہ ہونا جہاں قدیم فارسی ہندی (اردو) چپقلش کا نتیجہ ہو سکتی ہے ، شاہ گلشن کی صحبت کا اثر بھی لگا سکتی ہے ۔محمد حسین آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ دلی کے اکثر ریختہ گو شاعر اور اساتذہ خان آرزو کے تربیت یافتہ ہیں ان میں میر ، سودا ، درد جیسے شاعروں کے نام بھی لیے جاتے ہیں ۔

خود خواجہ میر درد جو اپنے عہد کے عظیم شاعر اور بزرگ تھے شاہ گلشن سے راست متعلق بھی رہے ہیں ۔ خواجہ میر درد کے والد خواجہ ناصر عندلیب شاہ گلشن کے معتقد تھے ۔ ان کی وساطت سے خواجہ میر درد کا شاہ گلشن سے راست تعلق بھی تھا ۔ خان آرزو نے مجمع النفائس میں شاہ گلشن کو خواجہ ناصر عندلیب کے پیر صحبت کہا ہے۔ کہتے ہیں :[1]

''شاہ گلشن مریدان صاحب احوال داشتند یکے ازان حضرت خواجہ ناصر کہ حضرت گلشن پیر صحبت ایشانند''

صاحب خزینۃالاصفیا نے حضرت خواجہ ناصر عندلیب اور شاہ گلشن کی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔[2] مولف مزارات اولیائے دہلی لکھتے ہیں کہ خواجہ محمد ناصر عندلیب شاہ گلشن کے خلیفہ تھے۔[3] مولف یادگار دہلی بھی یہی لکھتے ہیں ۔[4] مولف واقعات دارالحکومت دہلی نے بھی انہیں خلیفہ ہی لکھا ہے۔[5] شوق رام پوری نے تذکرہ جام جہاں نما میں اس تعلق کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :[6]

''خواجہ ناصر عندلیب نسبت مریدی از قدوۃ السالکین شاہ گلشن کہ در عہد عالم گیر اورنگ زیب از مقتدائے زمانہ بود داشت''

مولانا محمد حسین آزاد نے اتنا لکھا ہے کہ :[7]

---

۱- مجمع النفائس مخطوطہ ، ص ۳۱۸ الف
۲- خزینۃالاصفیا ، ص ۶۷۰
۳- مزارات اولیائے دہلی ، ص ۱۱
۴- یادگار دہلی ، ص ۹۴
۵- واقعات دارالحکومت دہلی ، جلد دوم
۶- تذکرہ جام جہاں نما ، مخطوطہ ص ۳۵۶
۷- آب حیات ، ص ۱۸۴

''(ناصر عندلیب) خواجہ میر درد کے باپ تھے اور شاہ گلشن سے نسبت ارادت رکھتے تھے''

لیکن حقیقت وہی ہے جس کا ذکر مجمع النفائس میں خان آرزو نے کیا ہے کہ خواجہ ناصر عندلیب ان کے صحبت یافتہ تھے[1] یا خان آرزو کے الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ شاہ گلشن خواجہ ناصر عندلیب کے پیر صحبت تھے۔ ان کے اصل پیر خواجہ محمد زبیر نقشبندی تھے اور انھوں نے یہ بیعت شاہ گلشن کی نصیحت پر ہی کی تھی۔ سرسید احمد خان نے آثارالصنادید میں لکھا ہے کہ[2]:

''خواجہ عندلیب نے بموجب ہدایت شاہ گلشن صاحب کے حضرت خواجہ محمد زبیر سے بیعت کی تھی''

خواجہ ناصر عندلیب نے اپنے قلمی رسالہ ہوش افزا میں خود لکھا ہے کہ:

''بہ میان حلقہ ہائے ایشان (یعنی خواجہ زبیر) نشستہ ام''

اس کی کتاب مشہور کتاب حالات و مقالات مرزا مظہر جانجاں سے بھی ہوتی ہے۔ لکھا ہے کہ:[3]

''حضرت محمد زبیر غوث وقت بودند و خواجہ ناصر و شاہ عبدالعدل و مردمان بسیار در طریقۂ ایشاں ہستند''

شاہ گلشن کا خواجہ ناصر عندلیب پر، پھر ان کے ذریعے اردو کے مشہور صوفی شاعر خواجہ میر درد پر سہ گونہ اثر تھا۔ روحانی، شاعرانہ اور موسیقانہ۔ روحانی تعلق کا ذکر ہو چکا شاعرانہ اور موسیقانہ اثر کا ذکر اس لئے ضروری ہے تاکہ پتہ چلے کہ خواجہ میر درد اور ان کے ذریعے دوسرے اردو شاعروں پر شاہ گلشن کا ہی فیضان ہے، خواجہ ناصر عندلیب بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے ان کے اس شوق کا ذکر خان آرزو نے مجمع النفائس میں کیا ہے اور ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ[4]:

''ہرچند شاعری دون مرتبہ ایشاں است اما گاہے گاہے بہ موزونی طبع شعر می گویند''

خواجہ میر درد اردو کے عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بارہویں صدی ہجری کے اولیائے عظام میں سے تھے اس لیے تذکرہ نگاروں نے ان کے متعلق بھی وہی ریمارکس دئے ہیں جو خواجہ ناصر عندلیب کے متعلق اوپر مذکور ہوئے

---

۱- مجمع النفائس، ص ۳۱۸ الف
۲- آثار الصنادید، باب تیسرا، ص ۲۲
۳- حالات و مقامات مرزا مظہر جانجاں، ص ۲۵ حاشیہ
۴- مجمع النفائس مخطوطہ، ص ۳۱۸ الف

ہیں ''یعنی شاعری دون مرتبۂ است'' شاہ گلشن کے خواجہ میر درد اور ان کے خاندان پر شاعرانہ اثر کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ خواجہ میر درد کے والد خواجہ ناصر نے اپنے مرشد شاہ گلشن کی نسبت سے اپنا تخلص عندلیب رکھا۔ خواجہ میر درد نے عندلیب کی مناسبت سے درد اور ان کے بھائی خواجہ میر اثر نے درد کی نسبت سے اثر تخلص کیا ۔ اور پھر خواجہ میر درد کے بیٹے نے درد اور اثر کے تعلق کے ناتے اپنا تخلص الم اختیار کیا۔ خواجہ میر درد اور ان کے والد ناصر عندلیب نے اپنے کئی فارسی شعروں میں شاہ گلشن کے فیضان کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً خواجہ میر درد کہتے ہیں ۔

قدرے این نا چیز را داند جناب عندلیب

گرچہ جز کاہے نہ ام اما گیاہ گلشنم

خواجہ میر درد کے زمانے کے ایک اور نقشبندی بزرگ مرزا مظہر جانجاں پر بھی شاہ گلشن کی صحبت کا کچھ نہ کچھ اثر تھا ۔ مرزا موصوف صرف عالم اور بزرگ ہی نہ تھے بلکہ فارسی اور ریختہ کے شاعر بھی تھے اور اصلاح ریختہ کی تحریک کے نقیب بھی تھے ۔ کتاب معمولات مظہریہ میں مرزا کے شاہ گلشن دہلوی سے تعلق کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے ۔

''بعد ازاں بخدمت شاہ گلشن کہ خلیفہ شیخ عبدالاحد سرہندی و نبیرہ حضرت مجدد بودند رفتند۔ چوں معلوم شد کہ ایشاں یاران خود را بخدمت محمد زبیر قدس سرہٗ کہ نبیرۂ حضرت مجدد الف ثانی بودند سپردند رجوع بخدمت حضرت محمد زبیر آوردند ایشان فرمودند شما را نسبت صحیحہ از حضرت رسیدہ است ہماں نسبت را محافظت نماید کہ ثمرآں بہ ظہور آید''

تذکرہ نگاروں نے مرزا مظہر جان جاناں کے فارسی کلام کو سلیم اور کلیم کی ٹکر کا کہا ہے لیکن زیر بحث موضوع کے نقطہ نظر سے مرزا موصوف کا اہم کام ریختہ کی طرف متوجہ ہو کر اس کی بے اعتباری کو اعتبار بخشنا اور اسے ہندی اور ایہام سے پاک کر کے فارسی کے قریب لانا اور مصفی و منزہ کرنا ہے، یہ ان کا ریختہ پر بہت بڑا احسان ہے اور یہ کہنا بےجا نہ ہوگا کہ اس ''عمل صالح'' میں شاہ گلشن کی صحبت اور تربیت کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور تھا ۔

سرخیل ایہام گویاں شاہ مبارک کے شاہ گلشن کی صحبت اختیاری کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ، میرزا حاتم بیگ دہلوی کو لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے شاہ گلشن دہلوی کا مرید اور میرزا ایزد بخش رسا کا شاگرد لکھا ہے ۔ ساتھ یہ

---

۱- معمولات مظہریہ ۔ ص ۱۴

بھی کہا ہے کہ[1] -

''با سراج الدین آرزو صحبت داشت''

چند ہندو شاعر بھی شاہ گلشن کی ہم نشینی اور شاگردی کا شرف رکھتے ہیں - ان میں ایک لالہ حکیم چند نذرت ہیں جن کے متعلق گل رعنا میں یوں لکھا ہے[2]-

''بارہا صحبت مرزا بیدل و شاہ گلشن مرحوم و خان آرزو و دیگر شعرائے نامدار وقت دریافت و فیض ہائے بسیار برداشت''

آنند رام مخلص کے چار بیٹوں میں سے ایک بیٹا خوش حال رائے المتخلص بہ رند بھی شاہ گلشن کا شاگرد تھا - سراج الدین علی خان آرزو نے تذکرہ مجمع النفائس میں اس کا ذکر کیا ہے- وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ[3] :

''اکثر خوانند ہائے دہلی مرید و معتقد او (شاہ گلشن) بودند''

ان ''خوانند ہائے'' میں گویے بھی ہوں گے موسیقار بھی ، فارسی کے شاعر بھی ہوں گے اور ریختہ کے ابتدائی نقیب بھی - بہر حال ایک بات واضح ہے کہ بارھویں صدی ہجری کی دلی میں روحانی اقتدار تبلیغ ، سماع (موسیقی) کی ترویج اور فارسی شاعری کے رواج کے ساتھ ساتھ فارسی سے ریختہ کی طرف گریز کے عمل اور اس عمل میں روح پھونکنے میں شاہ گلشن دھلوی کا مرکزی اور بنیادی ہاتھ ہے -

''خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را''

---

۱- گل رعنا مخطوطہ فارسی ، ص ۱۰۸ ب

۲- گل رعنا مخطوطہ فارسی، ص ۳۳۲ الف

۳- مجمع النفائس - ص ۴۱۸